بانو قدسیہ کے ناولٹ "موم کی گلیاں"۔۔۔ایک مطالعہ

Bano Qudsias' Novel "Moom ki Galian". A study

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2024.08032241

ڈاکٹر پروین اختر کلو
Dr Parveen Akhtar Kallu
Associate Professor, Department of Urdu
Govt. College University, Faisalabad

ڈاکٹر صائمہ اقبال
Dr Saima Iqbal
Assistant Professor, Department of Urdu
Govt. College University, Faisalabad

زینب اقبال
Zanib Iqbal
MPhil Scholar, Department of Urdu
Govt. College University, Faisalabad

Abstract:

"Moom ki Galian" is an allegorical novelit. Bano has done justice to the analogy of human society and the Honeycomb. Especially the points of Apiology have been presented with great precision and skill. This novelit is meaningful and interesting from start to finish. This novel will be considered an important milestone in the history of fictional literature. She narrates examples of animals mocking humans at many points. This style of Bano Qudsia is unique and quirky. Due to which he has a prominent position in Urdu literature. The main purpose of this novel is to correct the evils found in our society, so Bano Qudsia narrates two stories and by giving a light romantic color, she is comparing the human society and their organization, arrangement, lifestyle. But while doing this, she has also conveyed his extensive knowledge and deep observation to us through this novelit.

Keywords:

Bano Qudsia , Animals, novelit "Moom ki Glian", allegorical

بانو قدسیہ اردو ادب کی ایک ایسی نابغۂ روزگار ہستی ہیں جو بیک وقت دوہری شخصیت کی مالک ہیں، ایک بانو، دوسری قدسیہ۔ بانو جو بے پناہ تخلیقی قوتوں کی مالک مصنفہ ہیں۔ وہ حساس دل و دماغ کی مالک معاشرے کی نباض اور ایک صاحبِ رائے ہیں۔ اپنے ارد گرد رونما ہونے والے حالات و واقعات کا بہ نظرِ عمیق مشاہدہ کر کے ایک نئے روپ میں قاری کے سامنے پیش کرتی ہیں۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے کئی پہلو ہیں۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ، شخصیت نگاری غرض نثر کی مختلف اصناف پر انھوں نے طبع آزمائی کی اور ہر جگہ ان کی قد آور شخصیت اور ان کی فنی ذکاوت نمایاں نظر آتی ہے۔ ممتاز مفتی بانو قدسیہ کی دورخی شخصیت کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بانو قدسیہ کو غالباً کوئی بھی نہیں جانتا اس لیے کہ بانو قدسیہ ایک نہیں دو افراد ہیں جس طرح کسی کسی بادام میں دو مغز موجود ہوتے ہیں۔ اس طرح بانو قدسیہ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں۔ الگ الگ۔ ایک بانو۔ دوسری قدسیہ۔''(۱)

بانو قدسیہ نے خود کو پتی بھگتی کے حصار میں اس حد تک مقید کر لیا تھا کہ اشفاق احمد کے ہر دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھتیں۔ اشفاق احمد کو کوئی تکلیف پہنچتی تو بانو قدسیہ تڑپ اٹھتیں۔ ان کی تمام مشکلات اور مصائب میں برابر کی شریک ہوتیں۔ اشفاق احمد تصنیف و تالیف کے کاموں میں مشغول ہوتے تو گھر داری کے تمام امور کو خود ہی نبٹاتیں۔ یہی وجہ ہے کہ اشفاق احمد کو تمام عمر کبھی شکایت کا موقع فراہم نہ کیا۔ اس سے بانو قدسیہ کی اپنی گھریلو زندگی سے موانست اور اشفاق احمد سے بے لوث محبت اور چاہت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ایک اور جگہ ممتاز مفتی بانو قدسیہ کی شخصیت کے اس رخ کو یوں بے نقاب کرتے ہیں:

> ''اشفاق بیوی کی آمد کے بعد بالکل ہی دیوتا بن گیا۔ کانٹا اشفاق کو چبھتا ہے تو درد بانو کو ہوتا ہے، ہتھ چکی اشفاق چلاتا ہے تو آبلے بانو کے ہاتھوں میں پڑتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک خالص پکی دانشور نے پتی بھگتی میں اپنا سب کچھ جذبات، ذہن، روح تیاگ رکھا ہے۔ بانو بہت بڑی مفکر ہے۔ وہ ہر بات میں صاحبِ رائے ہے۔ عقل و خرد سے بھرپور لیکن جب اشفاق طلوع ہو جائے تو سب کچھ سپاٹ ہو جاتا ہے۔ عقل و خرد دانشوری۔''(۲)

بانو قدسیہ کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ اپنے اندر ایک جہانِ معنی رکھتا ہے۔ وہ ایک ایسی دیدہ ور شخصیت ہیں جو نرگس کی ہزاروں سال اپنی بے نوری پر رونے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ ماہنامہ ''ادبِ لطیف'' میں ذکاء الرحمن اور سید جاوید اختر کا ایک مضمون ''جان پہچان'' کے نام سے ملتا ہے جس میں انھوں نے مختلف ادیبوں کے بارے میں لکھا ہے۔ اس مضمون میں بانو قدسیہ کے بارے میں انھوں نے لکھا:

> ''اردو کے نامور افسانہ نگار اشفاق احمد کی نصف بہتر، داستان گو، کی سابق مدیرہ، تین یا شاید

چار نٹ کھٹ بچوں کی شفیق ماں، منفرد افسانہ نگار۔ اس کی کہانیاں اردو ادب کی آبرہ ہیں، جن میں تلوار کی خاٹ بھی ہے اور نود میدہ کلیوں کی شگفتگی بھی۔ اس کے گھر ملنے جاؤ تو خواہ ماہِ صیام ہو، مونگ پھلیوں، کیلوں اور چلغوزوں سے تواضع کرتی ہے، بہت کم لکھتی ہے، مگر جو کچھ لکھتی ہے ادب کی شاہ راہ کا سنگِ میل بن جاتا ہے۔ اس کی انگلیاں سوئیٹر بنتی ہیں، ذہن کہانیوں کے تانے بانے بنتا ہے اور زبان خان صاحب (اشفاق احمد) کا ورد کرتی ہے۔"(۳)

بانو قدسیہ انتہائی منکسر المزاج شخصیت کی مالک ہیں۔ تمام عمر خود کو خوشامد کے مسموم اثرات سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی۔ لوگوں کے ستائشی کلمات کے جواب میں ہمیشہ عجز و انکسار سے کام لیا، غرور و تکبر، انا پرستی نام کی چیز کبھی قریب نہ پھٹکنے دی، باوجود اعلیٰ پائے کی تخلیقات کی حامل ہونے کے ہمیشہ اپنی علمی کم مائیگی کا اظہار کیا اور اپنی عظیم الشان کامرانیوں پر اترانے کی بجائے علم و ادب کے میدان میں ہمیشہ اپنے آپ کو مبتدی سمجھا۔ انہیں ساری عمر بے پناہ مقبولیت ملی لیکن خود پسندی کو کبھی آڑے نہ آنے دیا۔ ۱۹۸۵ء میں ان کے افسانوں کے تین مجموعے "امر بیل"، "بازگشت" اور "کچھ اور نہیں" یکجا صورت میں "توجہ کی طالب" کے نام سے منظرِ عام پر آئے تو اس کتاب اور اپنے افسانوں سے متعلق کتاب کے فلیپ پر لکھتی ہیں:

"یہ افسانے میری تیس سالہ ادبی زندگی کے وہ ٹیلے ہیں جو مختلف سمتوں میں چلنے والی ہواؤں نے اکٹھے کیے ہیں، لیکن میرا ادبی کام نہ تو کسی قسم کا سنگِ میل ہے اور نہ ہی اسے آپ کسی داستان کی شروعات کہہ سکتے ہیں۔ بڑے کام بڑے لوگوں سے سرزد ہوتے ہیں جس کی توفیق خدا سے ملتی ہے اور بسا اوقات وہ اپنی تخلیقات کو اپنی کڑی محنت سے منسوب کر کے ایک ایسے زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں جو اس کے کام کے لیے تو نہیں ذات کے لیے ضرر رساں ثابت ہوتا ہے۔"(۴)

یہ اقتباس بانو قدسیہ کی فنی شخصیت کا انکسار اور ان کا ذاتی عجز سامنے لاتا ہے۔ وہ اپنی کتابیں پڑھنے والوں کے سامنے پیش کرتی ہیں تو کسی احساسِ برتری یا اپنی انا کی پرورش کار نظر نہیں آتیں۔ بانو قدسیہ زندگی پر ایک قانع انسان کی مانند نظر ڈالتی ہیں اور اس کے عملی زاویوں کو بھی نظر انداز نہیں کرتیں۔ وہ اپنی خوبیوں کا کبھی کھل کر اعتراف نہیں کرتیں۔ اگر کوئی ان کی کسی خوبی کا ذکر ان کے سامنے کرے تو ایسے مواقع پر اپنے جمال ذات کے سحر میں گم عام خواتین کے برعکس ان کی نسوانیت پر فطری شرم اور انکسار غالب آجاتا ہے۔ جہاں اپنی خوبیوں کے سامنے عاجزی اور فروتنی کا اظہار کرتی ہیں وہیں اپنی خامیوں اور کمزوریوں کا اعتراف بھی بڑی جرأت مندی سے ان الفاظ میں کیا جس سے یہ حقیقت

آشکار ہوتی ہے کہ بانو قدسیہ اپنی شخصیت کا حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتی ہیں اور آئینے سے وہی تصویر منعکس کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور لکھتی ہیں:

> ''مفتی جی! میری پہلی اور ناقابل معافی کمزوری تو یہ ہے کہ میں ایک اچھی بیٹی نہیں ہوں۔ میں نے اپنی ماں کے دل کا کبھی اس طرح سے خیال انصاف پرست نہیں ہوں۔ جہاں مامتا ایک بہت بڑی خوبی ہے وہیں اس نے مجھ سے انصاف پرستی کا وصف چھین لیا ہے۔ میری محبت اچھا برا سب کچھ ڈھانپتی جاتی ہے۔ عورت ماں بن کر اندھی ہو جاتی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے بے انصافی بڑے انوکھے زاویے اختیار کرتی ہے۔ کیا کروں؟ یہ بات سرشت میں نہ ہوتی تو اس کا علاج کرتی۔ بے انصافی سے ''عظیم ماں'' بنی ہوں تو اس کے منفی پہلو سے کیوں کر کنی کتراؤں؟''(۵)

بانو قدسیہ اردو ادب کی ہمہ جہت شخصیت ہیں۔ ان کا شمار دنیائے علم و ادب کی مشہور و معروف اور قابلِ قدر شخصیات میں ہوتا ہے۔ انھوں نے مستقل مزاجی اور جہدِ مسلسل سے مختلف حیثیتوں میں اپنے آپ کو منوایا۔ ان کا قلم اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں یکساں رواں ہے۔ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کے کئی پہلو ہیں۔ افسانہ، ناول، ڈرامہ اور شخصیت نگاری غرض نثر کی مختلف اصناف پر طبع آزمائی کی اور ہر جگہ ان کی قد آور شخصیت اور ان کی فنی ذکاوت نمایاں نظر آتی ہے۔ اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی میں بھی ڈرامے لکھ کر اپنے آپ کو منوایا۔ نثر کے علاوہ شاعری میں پنجابی نظمیں لکھیں لیکن شاعری میں طبع آزمائی کرنے کے باوجود اطمینان اور تسلی نہ ہوئی اس لیے نثر کو ہی اپنے خیالات کے اظہار کا وسیلہ بنایا۔ ان کے فن پارے مختلف ادبی رسائل میں چھپتے رہے جنہیں بعد میں سنگِ میل پبلی کیشنز کتابی صورت میں مرتب کر دیا۔

بانو قدسیہ نے چار ناولٹ لکھے۔ ان کے ناولٹ کا مجموعہ چہار چمن کے نام سے ہے۔ بانو قدسیہ کے ناولٹوں میں مختلف موضوع موجود ہیں جن میں جذبہ حب الوطنی، دیہاتی اور شہری زندگی کو بیان کیا گیا ہے ان کے ناولٹ ''موم کی گلیاں'' میں حیوانات کا ذکر بخوبی ملتا ہے اور یہ ناولٹ بانو قدسیہ کی بھرپور ذہانت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ اس ناولٹ کا بنیادی مقصد تو ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی برائیوں کی اصلاح ہے اس لیے بانو قدسیہ دو کہانیوں کو بیان کرتی ہیں اور ایک ہلکا پھلکا رومانوی رنگ دیتے ہوئے وہ انسانی معاشرے اور ان کی تنظیم، ترتیب، رہن سہن کا تقابل کر رہی ہیں لیکن یہ کرتے ہوئے انھوں نے اس ناولٹ کے ذریعے اپنی وسیع معلومات اور گہرے مشاہدے کو بھی ہم تک پہنچایا ہے اور اس طرح وہ ایک معلوماتی ناولٹ لکھنے میں بھی مکمل طور پر کامیاب نظر آتی ہیں۔

''رکی ٹکی'' جو کہ کہانی میں راوی کا کردار ادا کر رہا ہے شروع میں ہی دکھایا گیا ہے کہ وہ جانوروں اور حشرات میں

گہری دلچسپی رکھتا ہے اور بانو اپنی معلومات کو اسی زبان سے بیان کرتی نظر آتی ہیں۔ کہانی کا باقاعدہ آغاز تب ہوتا ہے جب سارا خاندان مری جاتا ہے اور جس گھر میں وہ ٹھہرے ہوئے ہیں اس میں اخروٹ کا ایک درخت ہے۔ جہاں شہد کی مکھیاں چھتہ بنا رہی ہیں تور کی ٹکی اس کو فرسٹ ایڈ مہیا کرتا ہے۔

شہد کی مکھیاں ایک ایسی مخلوق ہے جو صبح شام محنت کرتی ہے اور ایسی منظم زندگی بسر کرتی ہے۔ اور ان کے ہاں سوشلسٹ۔ کیمونسٹ، جمہوریت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ان کی ڈکٹیٹر ملکہ، مطلق العنان شیر ازی قدم قدم پر فرمان جاری کرتی ہے لیکن اس کو ہر لمحہ چھتے کی زندگی سنوارنے کی فکر ہوتی ہے صرف ایک چھتہ میں عام طور پر ساٹھ سے ستر ہزار مکھیاں رہتی ہیں اور یہ مکھیاں اتنی تنظیم و ترتیب کا مظاہرہ کرتی ہے حالانکہ اس شہر میں نہ کوئی سپاہی ٹریفک کے لیے مقرر ہے نہ کسی بھی قسم کے سائن بورڈ آویزاں ہیں لیکن پھر بھی وہ اپنے اپنے کام میں مکمل طور پر مگن اور سرگرم نظر آتی ہیں۔

اگر ان کے چھتہ کو اندر سے دیکھیں تو ایسا گمان گزرتا ہے جیسے کسی آئینہ ساز نے بنایا ہو کیونکہ اس میں حلبی شیشے، آراستہ سڑکیں، بڑے بڑے شہد آگیں گودام، حرم سرائیں، مہمان خانے، محلات، گلیاں کوچے سب موجود ہیں اور عمارت اتنی پختہ اور خوب صورت ہوتی ہے کہ کوئی انسان بنانا بھی چاہے تو نہ بنا سکے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ایک چھتہ دوسرے چھتے سے چھوٹا ہو تو ہو، مختلف کبھی نہیں ہوتا اور اس شہر کی سڑکوں میں بیلچے کی شکل کی لمبی چمکدار پیلی گوند جابجا لٹکی ہوتی ہے۔ ان ہی بھٹوں کے دونوں طرف مکھیاں متواتر کام کرتی ہیں۔ ایک بھٹے سے دوسرے بھٹے تک بمشکل تمام انچ کے آٹھویں حصے برابر فاصلہ ہوتا ہے لیکن سارے بھٹوں میں یہ فاصلہ ہمیشہ برابر اور متوازی ہوتا ہے۔

چھتہ کی تعمیر کے بارے میں بانو اس طرح لکھتی ہیں:

> "ملکہ اپنے کارکنوں کو لے کر کسی ایسی جگہ کی تلاش میں چل کھڑی ہوتی ہے، جہاں پہنچ کر وہ اپنا گھر تعمیر کرنا چاہتی ہو۔ کسی درخت کی کھوہ یا شاخ کا انتخاب کرنے کے بعد ملکہ تو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ رہتی ہے کہ کب زچہ خانہ تیار ہو تو انڈے دے۔۔۔۔۔ تمام مکھیاں اپنا اپنا زرگل سمیٹ کر ملکہ کے ارد گرد آ بیٹھی ہیں اور اٹھارہ سے چوبیس گھنٹے تک اسی جگہ بیٹھی رہتی ہیں پھر ہر مکھی کے پیٹ پر سے چھوٹے چھوٹے جھلی جواہرات اترنے لگتے ہیں۔ موم بنانے والی کارکن مکھی کے پیٹ میں قدرت نے چار جیبیں سی بنا رکھی ہیں جن میں وہ ان جھلیوں کو رکھ کر موم بناتی ہیں جونہی تمام مکھیوں کے موم سے بھرے یہ خانے اتر جاتے ہیں۔ ایک انجینئر مکھی سنگِ بنیاد ڈالنے کے لیے آگے بڑھتی ہے۔۔۔۔۔ اِس اثنا میں "پتھر" گھڑنے کا مشغلہ باقی مکھیوں میں جاری ہو چکا ہوتا ہے۔ پہلی مکھی جونہی سنگِ

بنیاد رکھ کر پلٹتی ہے۔ ایک اور مکھی بڑھتی ہے اور اپنا قیمتی ریزہ نہایت سلیقے سے جما آتی ہے اگر اسے پہلی مکھی کے کام میں کچھ نقص نظر آتا ہے تو وہ تکلیف بغیر جتائے اسے درست کر دیتی ہے ہولے ہولے موم کا ایک تودا یہاں جمع ہو جاتا ہے اور اصل عمارت کا نقشہ بننے کی آس بندھتی ہے۔ اب معماروں کی باری آتی ہے۔ یہ معمار مکھیاں خود تو موم نہیں بنا سکتیں حجرے تعمیر کرنا انہی کا کام ہے۔ اس موم کے تودے میں وہ کھدائی کرتی ہیں۔ وافر موم کو کناروں پر اٹھا کر اپنا راستہ لیتی ہیں اور آگے بڑھتی جاتی ہیں۔"(۶)

یہ حجرے تعمیر کرنے کے بعد زبان کی شکل کا ایک اور مومی تودا بنتا ہے ان پر پھر شش پہلو کمرے بنتے ہیں ان کمروں کی قطاریں ایک دوسرے سے کچھ معین فاصلے پر ہوتی ہیں اور جب چھتے کی تمام عمارت بن جاتی ہے تو یہ فاصلے راستے بن جاتے ہیں جن میں مکھیاں آتی جاتی ہیں۔ عموماً یہ عمومی گزرگاہیں اتنی کھلی ہوتی ہیں کہ دو مکھیاں پہلو بہ پہلو گزر سکتی ہیں۔ کبھی کبھار یہ کارکن مکھیاں اپنے معماروں کی طرح غلطیاں بھی کر بیٹھتی ہیں اور کبھی کبھار گلیوں کا راستہ بھی تنگ رہ جاتا ہے جس کی وجہ سے ون وے ٹریفک کے اصولوں پر چلنا پڑتا ہے اور منظم مکھیاں یہ ٹریفک کنٹرول کرتی ہیں۔

چھتے کی عمارت بڑی خوبی سے بنائی جاتی ہے اور اس میں چار قسم کی کوٹھڑیاں ہوتی ہیں۔ شاہی ہجرے میں جن میں شہزادیاں پرورش پاتی ہیں پھر وہ بڑے کمرے جن میں نر مکھیوں کا ٹھکانہ ہوتا ہے اور جن میں شہد جمع کیا جاتا ہے۔ تیسری قسم کی کوٹھڑیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے اور سارے چھتے میں قریباً ۳/۴ حصہ ان ہی حجروں پر مشتمل ہوتا ہے پھر وہ ننھے ننھے کمرے اور گیلریاں بھی ہوتی ہیں جو ان سارے حجروں کو آپس میں ملانے کا کام دیتی ہے۔ ان کی وضع قطع میں وہ مناسبت اور نفاست نہیں ہوتی جو باقی حجروں میں دکھائی دیتی ہے۔

بیشتر سائنس دانوں کو یہ بات متحیر کیے ہوئے ہے کہ جب بھی یہ حجرے تعمیر کیے جاتے ہیں ان کی عمارت چھ گوشیہ ہی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ نکلی کہ چونکہ دونوں طرف سے مکھیاں برابر کام کر رہی ہوتی ہیں ان کی منشا ہوتی ہے کہ کمرے گول بنیں تو مکھیوں کی قوت کا باہمی تصادم یہ کونے پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے اگر مٹر کے دانے تنگ دیگچی میں ڈال کر ابالے جائیں تو وہ شش پہلو بن جاتے ہیں۔ کیونکہ ہر دانہ برابر کی قوت سے دوسرے دانے کو دباتا ہے۔ اس طرح ہر مکھی کی ہوس ناک خواہش مجموعی طور پر ایک خوبی بن جاتی ہے اور چھتے کے لیے اتنی مفید ثابت ہوتی ہے کہ یہ حرص و طمع ہی ان کی بہبودی کا باعث بنتی ہے۔

ان لاکھ حجروں میں سے دس ہزار کوٹھڑیوں میں انڈے ہوتے ہیں۔ قریباً پندرہ سولہ ہزار حجروں میں لاروا رہتا ہے۔ اسی لاروا کی دیکھ بھال دایہ مکھیاں کرتی ہیں۔ قریباً چالیس ہزار کوٹھڑیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں جل پریاں سی رہتی ہیں۔ یہ جل پریاں لاروا ہوتی ہیں۔ جنھیں شہزادی یا محنتی مکھی یا نکھٹو بننا ہوتا ہے۔ ملکہ حجروں میں نیلگوں سفید لمبوترے

انڈے دیتی ہے جونہی ملکہ انڈا دے چکتی ہے دایہ مکھیاں اس کے پاس جل پری کی خوراک دھر دیتی ہے تاکہ انڈے سے نکلنے کے بعد وہ بھوکوں نہ مر جائے انڈا پھوٹنے کے بعد لاروا آٹھ دس دِن تک اسی شکل میں رہتا ہے۔ اِس کے بعد باقی مکھیاں جل پریوں کے حجرے بند کر دیتی ہیں اور یہ لاروا ریشم کے کیڑوں جیسا پتلا کویا اپنے گرد بن کر پڑا رہتا ہے۔

یہ حریر و پرنیاں میں لپٹی ہوئی چیزیں یوں لگتی ہیں گویا ریشمی کفنوں میں حنوط شدہ مومی لاشیں ہوں۔ تین چار اور کبھی کبھار سات آٹھ شاہی کمرے وہ ہوتے ہیں جن میں شہزادیاں آرام کرتی ہیں۔ یہ شاہی کمرے زیادہ کشادہ اور آرام دہ ہونے کے باوجود باہر کی طرف سے بالکل بند ہوتے ہیں۔ انھیں روشنی سے یوں بچایا جاتا ہے جیسے بڑی بوڑھیاں، مائیوں، بٹھا کر لڑکی کا رنگ روپ نکھارا کرتی ہیں۔ مستقبل کی یہ رانیاں سفید ریشم ایسے کفنوں میں لپٹی خاموش پڑی رہتی ہیں۔ جیسے اپنے انجام کو بخوبی جانتی ہوں۔ اِن کے ارد گرد گھومتی پھرتی کنواری کارکن مکھیوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ وہی انھیں کھلاتی پلاتی ہیں اِن کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی ہیں اور یہ شہزادیاں اِس تن آسانی کے باوجود سوچتی ہوں گی کہ مالک ہو کر محکوم ہونا۔ شہزادی بن کر رنڈیوں کی سی زندگی کرنا، محبت کے لیے پیدا ہونے کے باوجود اِس کیفیت سے گریزاں رہنا کتنا مشکل ہے کتنا کٹھن ہے۔

> "۔۔۔اِتنی لاتعداد مکھیاں ہر لمحہ زرِ گل بناتی ہیں۔ موم اور شہر کی دنیا میں کتنا گند جمع ہو سکتا ہے اس کا اندازہ لگا لیجیے۔ لیکن یہاں کے خاکروب کبھی ہاتھ پر ہاتھ دھر کر نہیں بیٹھ جاتے۔ ادھر کچھ گرا ادھر انھوں نے سمیٹا۔ ہوا کے جھونکوں سے جو ریت اور پتے اندر آجاتے ہیں انھیں فی الفور اٹھا لیا جاتا ہے۔ سردیوں میں جب ژالہ باری ان مکھیوں کو باہر نکلنے نہیں دیتی تو یہ صفائی پسند مکھیاں ہزاروں کی تعداد میں مر جاتی ہیں۔ کیونکہ ارد گرد کا پھیلا ہوا کوڑا کرکٹ اِن کی صحت کے لیے بہت مضر ثابت ہوتا ہے۔"(۷)

یہاں پر بانو قدسیہ نے انسانی معاشرے کی بھی عکاسی کر دی ہے کہ ہمارے معاشرے میں بھی تو بہت سے ایسے نوجوان ہیں جو اصطبل کے سانڈوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ کھا لیتے ہیں سو جاتے ہیں، جہاں کپڑے بدلے پرانے جامے کو اٹھانا بھی گوارا نہیں کیا، جس شیشی کا ڈھکنا کھولا بند کرنا بھول گئے۔ خط کو پڑھا تو واپس ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ شہد کی مکھیوں کے بارے میں مزید معلومات فراہم کرتیں وہ لکھتی ہیں:

> "ایک چھتے میں اپریل سے لے کر ستمبر تک قریباً چھ من شہد تیار ہوتا ہے۔ ایک بوند شہد کے لیے قریباً تین سو پھولوں کا زرِ گل ڈھونڈنا پڑتا ہے اور ہر مکھی قریباً دو منٹ بعد اپنی ٹوکری بھر کر گھر لوٹتی ہے۔"(۸)

پھر چھتہ کی ساخت، بناوٹ اور مکھیوں کی کفایت شعاری اور دور اندیشی کے بارے میں لکھتی ہیں:

"شش پہلو کمرے ایک انچ میں پورے اٹھائیں سماتے ہیں۔ ان کی موم ساٹن کی طرح ملائم اور زرد سنگ کی طرح پختہ ہوتی ہے۔ تمام حجرے چھتے کی ضرورت کو مدِ نظر رکھ کر تعمیر کیے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں ان حجروں میں کیا خاصیت ہے اگر کارکن مکھی کے حجرے میں ملکہ مکھی کبھی انڈا دیتی ہے تو کنواری محنتی مکھی پیدا ہوتی ہے اور اگر کھلے شاہی کمرے میں انڈا دے تو بھرپور شہزادی جنم لیتی ہے۔ یہ انڈے کی خاصیت پر منحصر نہیں ہے۔ ساری حجرے کی کرامات ہے۔ اگر شاہی محل کا انڈا نکال کر کارکن مکھی کے حجرے میں رکھ دیا جائے تو بائیس دن کے اندر اس میں ایک محنتی مکھی نکل آئے گی اور اگر یہی انڈا شاہی حجرے میں رکھا جاتا تو سولہ دن میں اس میں ایک شہزادی نکلتیجس سے چھتے کی تمام امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ جو آئندہ کئی چھتوں کی حاکم اور ملکہ بن کر زندگی گزارتی۔"(۹)

شہد کی مکھیاں اپنی حیرت انگیز سرگرمیوں کی وجہ سے زمانہ قدیم سے مشہور ہیں۔ کوئی قوم دنیا میں ایسی نہیں گزری جس نے شہد کی مکھیوں کی خوش ذائقہ اور مفید پیداوار سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ ایک بہترین عمارت بنانا اور اُس کے لیے انتھک محنت کرنے کا سبق انسان نے مکھیوں سے سیکھا ہے۔ اس کے علاوہ رموز سیاست، ایثار نفسی اور کفایت شعاری جیسے اسباق بھی انسانوں نے مکھیوں سے سیکھے ہیں قرآن پاک میں سورۂ نحل میں خود اللہ تعالیٰ نے اس مخلوق کی حُسن کارکردگی کو اپنی قدرت کی ایک نشانی قرار دیا ہے۔ اس کے بعد بانو مکھیوں کے متعلق بھی بتاتی ہیں کہ کارکن مکھیاں الگ ہوتی ہیں اور نر مکھیاں الگ یعنی ان کی ساخت میں بھی فرق پایا جاتا ہے:

"ننھی سی کارکن مکھی کو اللہ میاں نے ایسی بہت سی چیزیں عطا کی ہیں جن کی مدد سے وہ امرت بناتی ہے۔ زیرہ گل اکٹھا کرتی ہے اور شہد جمع کرتی ہے۔ ایک تو وہ نالی ہوتی ہے جس کی مدد سے وہ پھولوں کا امرت اڑاتی ہے پھر ٹانگوں پر تیکھے بالوں کی وہ ٹوکریاں ہیں جن میں وہ پھولوں کا زیرہ اکٹھا کرتا ہے۔"(۱۰)

بانو بتاتی ہیں کہ جیسے انسانوں میں لیلیٰ اور مجنوں کا تصور ہے بالکل اسی طرح مکھیوں میں بھی لیلیٰ مجنوں ہوتے ہیں لیکن ان میں لاکھوں مجنوں ایک ہی لیلیٰ کو حاصل کرنے کے لیے قسمت آزماتے ہیں:

"ہمارے ہاں تو ایک لیلیٰ کے پیچھے ایک ہی مجنوں بھاگا کرتا ہے؟ کوئی دوسرا بھی قسمت آزمائی کے درپے ہو تو رقیب روسیاہ کہلاتا ہے۔ مکھیوں میں لاکھوں مجنوں ایک ملکہ کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ ہر ایک سر دھڑ کی بازی لگاتا ہے۔ ہر ایک تن من دھن لٹانے پر رضامند ہوتا ہے۔ یہاں کوئی بوالہوس نہیں۔۔۔"(۱۱)

ایک چھتے میں جہاں ہزاروں کارکن مکھیاں ہوتی ہیں وہاں ایک ملکہ ہوتی ہے صرف ایک مطلق العنان رانی۔ محبت کرنے کا حق صرف ملکہ کو ہے اُسے اپنی رعایا پر حکومت کرنے کا فن آتا ہے باقی تمام مکھیاں اسی کے بچوں کی دایہ گیری میں اپنی عمر گنواتی ہیں۔ ان کے پہلو میں محبت کی آگ کبھی نہیں سلگتی انہیں اپنا گھر بسانے کی کبھی نہیں سوجھتی۔ ملکہ کی خوشنودی ہی کارکن مکھیوں کی زندگی ہوتی ہے۔ ملکہ کے عاشقوں میں کوئی بھی عاشق ایسا نہیں ہوتا جس نے محض تفریح طبع کے لیے محبت کا ڈھونگ رچا رکھا ہو۔ ان کے ہاں رومان کا رواج نہیں ہے ان سب کی قسمت میں تیرہ بختی لکھی ہوتی ہے جو ناکامیاب ہوئے وہ بھی بدنصیب اور جو شراب و وصال سے سرشار ہوئے وہ بھی بدنصیب ہے۔ اس کے بعد وہ مکھیوں کے ملاپ یا جنسی عمل کو بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں، جیسے کہ بانو شروع سے ہی خرم سے اس نظریے کا پرچار کرواتی ہیں کہ یہ سارا امر صرف و صرف افزائشِ نسل کا جھنجھٹ ہے۔ وہ کہتی ہیں:

> ”فطرت کا مقصد صرف افزائشِ نسل ہے۔ وہ سارے جھنجھٹ اسی لیے کرتی ہے سارے بکھیڑے اس نے اسی لیے کھڑے کر رکھے ہیں۔ اگر ملکہ کا صرف ایک عاشق ہوتا اور وہ اس کے تعاقب میں شادی سے پہلے مر جاتا تو کتنی آبادی لاوارث ہو جاتی۔ ہزاروں کنواری کارکن مکھیاں مر جائیں۔ ان کی گود میں جھار و پھیر جاتی اور سارے چھتے کی زندگی ختم ہو جاتی۔ ایک چھتے میں اسی لیے تین چار سو نر مگس ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی بظاہر بے مصرف ہوتی ہے اور ان کو سارا دن کھانے، سونے اور شور مچانے کے سوائے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ لیکن وہ بڑے کام کی چیزیں ہیں۔ کارکن مکھی کی نسبت نر مگس کا جسم بہت ہی خوبصورت اور چمکدار ہوتا ہے لیکن نر مگس کبھی اپنی خوراک تلاش نہیں کرتا۔۔۔“(۱۲)

تساہل پسند، نکھٹو عاشق جنھیں آج تک پیٹ کا دوزخ ہی بھرنا آتا تھا۔ ملکہ کو نکلتے دیکھ کر اس کے پیچھے ہو لیتے ہیں۔ صرف ایک ہی چھتے کے مرد اس رانی کو اپنانے کے لیے نہیں نکلتے، بلکہ ارد گرد کے چھتوں میں بسنے والے عاشق بھی خیر پاتے ہی چل نکلتے ہیں۔ وہی قوت جو ان کے دل میں یک لخت محبت کی آگ روشن کرتی ہے۔ افزائشِ نسل کی پکار، اپنی بقا کی جدوجہد، مر مٹنے کی شدید تمنا۔۔۔ انھیں کنواری ملکہ کا پتہ نہیں دیتا پھر بھی قریبی چھتوں کے تمام بانکے سینہ سپر ہو کر چل نکلتے ہیں۔ بعض اوقات تو ایک ملکہ کے تعاقب میں دس ہزار نر مگس کی فوج کفن سر پر باندھ کر نکلتی ہے۔ جوں جوں ملکہ بلندیاں طے کرتی جاتی ہے پرواز کناں عاشقوں کا دم پھولتا جاتا ہے۔ کمزور، بیمار، بوڑھے نر مگس گرتے جاتے ہیں۔ جواں سال باہمت اور صحت مند ملکہ کے پیچھے پیچھے ہوا کے دوش پر اونچے اُڑتے جاتے ہیں۔ وہی نر جو کل تک نکھٹو اور بے مصرف تھے۔ ملکہ سے بیاہ رچانے کی امنگ دل میں لیے کیسی کیسی کوشش کرتے ہیں۔ اس لیے فطرت نے ان کے پر کارکن مکھیوں سے زیادہ بڑے بنائے ہیں اور فطرت نے جہاں کارکن مکھی کو ۱۲ ہزار آنکھیں عطا کی ہیں انھیں آنکھ کے تیئیس ہزار

محدب شیشوں سے نوازا ہے۔ تاکہ ملکہ کے تعاقب میں وہ کہیں راہ نہ بھول جائیں:

"ملکہ بڑھتی ہے عاشق پیچھے اُڑتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی طرح کوشش کی جاتی ہے۔ عام طور پر ایک ملکہ کے پیچھے ایک ہزار کا گروہ ہوتا ہے اور جب ملکہ آسمان کی نیلی گہرائیوں میں جا نکلتی ہے تو صرف دس، پندرہ جانباز اس کے پیچھے رہ جاتے ہیں۔ باقی تمام راہ کی صعوبتوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔"(۱۳)

پھر ان دس پندرہ کی ٹکڑی گھٹ کر دو تین پر مشتمل رہ جاتی ہے اور ان کے تھکے ہارے عاشقوں میں سے کوئی ایک پھر ایک آخری بار زور لگا کر ملکہ کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔۔۔ لیکن تادیر فطرت کو کسی کی جان عزیز نہیں ہے۔ وہ سب کچھ افزائشِ نسل کے لیے کرتی ہے۔ نر مگس ایک لمحے کی راحت میں اپنی جان کھو بیٹھتا ہے۔ جونہی اس کے بازو ملکہ کے گرد حمائل ہوتے ہیں اور وہ لذتِ وصل سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اس کے پیٹ کی جھلی پھٹ جاتی ہے۔ نر مگس اپنی روح زندگی کی ساری تمنائیں اور اپنی جان ہی ملکہ کی نذر نہیں کرتا ملکہ اپنے نچلے دھڑ کے لتھڑوں سے لتھڑی ہوئی گھر لوٹتی ہے:

"ملکہ اپنے نوشہ کی لاش کے ٹکڑے خاکروب مکھیوں کے حوالے کر کے اپنے دیوان میں داخل ہو جاتی ہے اور پھر کبھی بیاہ رچانے کی نہیں سوچتی۔ ایک شادی ایسی جانکاہ ثابت ہوتی ہے کہ اسے زندگی بھر حوصلہ نہیں پڑتا کہ نیلے آکاش کی پنہائیوں کا پھر رخ کرے۔"(۱۴)

"موم کی گلیاں" میں بھی مصنفہ نے علامتی تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ شہد کی مکھیوں کے حوالے سے نظم وضبط کا درس دیا ہے۔ بانو قدسیہ نے انسانوں اور شہد کی مکھیوں کے معاشرے کو اس ناولٹ میں اس طرح مدغم کیا ہے کہ مکھیوں کے معاشرے کی خوبیاں اور انسانی معاشرے کی خامیاں آشکار ہو گئی ہیں۔ شہد کی مکھیوں کے معاشرے کو بطور علامت پیش کیا اور اس وسیلے سے مصنفہ نے انسانی معاشرے کے مصائب نشان زد کرنے کی کوشش کی ہے:

"مکھیاں شریف النفس ہوتی ہیں انہیں اپنے کام سے کام ہوتا ہے۔ کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑانا ان کو شیوہ نہیں۔۔۔ انسان انانیت کا مارا ہوا ہے کسی کے تجربے سے نہیں سیکھتا۔ مکھیاں ایسی بیوقوف نہیں ہیں ان کا ایک چھتہ دوسرے چھتے سے چھوٹا ہو تو، مختلف کبھی نہیں ہوتا۔"(۱۵)

گویا شہد کی مکھیوں کا معاشرہ مثالی بنے لیکن انسانی معاشرہ اعلیٰ اقدار کا حاصل ہونے کے باوجود مثالی نہیں اقرار دیا جاسکتا۔ مختلف جانوروں اور پرندوں کے ذریعے بانو قدسیہ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان علامتوں کے استعمال سے مصنفہ نے جو زبان استعمال کی ہے وہ عام مہم اور واضح ہے جن کو پڑھتے ہوئے قاری کسی ابہام کا شکار نہیں ہوتا بلکہ

آسانی سے یہ علامتیں سمجھ آجاتی ہیں:

"آج میرے سامنے قدرت کی ایک مخلوق تھی جو صبح و شام محنت کرتی ہے جو ایسی منظم زندگی بسر کرتی ہے۔ جہاں شوشلسٹ، کمیونسٹ یا جمہوریت پسند کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، یہاں کی ڈکٹیٹر ملکہ، مطلق العنان شہزادی قدم قدم پر فرمان جاری کرتی ہے۔"(۱۶)

معلومات کو قارئین تک پہنچانے کے لیے بانو قدسیہ مکالمہ نگاری کا سہارا لیتی ہیں "موم کی گلیاں" میں شہد کی مکھیوں کے بارے میں معلومات مکالمہ نگاری کے ذریعے ہی پہنچائی گئی ہیں یہاں شہد کی مکھیوں کے بارے میں معلومات پہنچاتے ہوئے بعض اوقات مکالمے کی طوالت اختیار کر جاتے ہیں مگر قاری کے لیے اکتاہت کا باعث نہیں بنتے بلکہ بانو قدسیہ اپنے موثر طرز نگارش سے طویل مکالموں میں بھی جان ڈال دیتی ہیں۔ جس سے سارا وقت قاری کی دلچسپی قائم رہتی ہے۔ "موم کی گلیاں" سے رکی ٹکی اور عذرا کا مکالمہ ملاحظہ ہو جس میں بھائی اور بہن کے مکالمے کے ذریعے بانو قدسیہ شہد کی مکھیوں سے متعلق معلومات فراہم کر رہی ہیں:

"عذرا نے دلچسپی سے پوچھا۔ "تو یہ مکھیاں ہمیشہ گروہ میں کام کرتی ہیں کیا؟ کیا ان کی ذاتی اغراض نہیں ہوتی؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "ان کی تمام ذاتی اغراض ایک نقطہ پر مرکوز ہیں اور وہ نقطہ ہے مستقبل۔ ایک چھتے میں اپریل سے لے کر ستمبر تک قریباً چھ من شہد تیار ہوتا ہے۔ ایک بوند شہد کے لیے قریباً تین سو پھولوں کا زرگل ڈھونڈنا پڑتا ہے۔"(۱۷)

بانو قدسیہ نے شہد کی مکھیوں کے معاشرے کو بطور علامت پیش کیا ہے۔ یہاں مصنفہ نے شہد کی مکھیوں کی خوبیاں بیان کر کے درپردہ انسانی سماج کی خامیوں کو آشکار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے خیال میں شہد کی مکھیوں کا معاشرہ مثالی ہے۔ مکھیاں انتہائی شریف النفس ہوتی ہیں۔ وہ اپنے کام سے کام رکھتی ہیں اور کسی دوسرے کے کام میں مداخلت نہیں کرتیں۔ اتنی چھوٹی مخلوق ہونے کے باوجود انتہائی محنت اور مستقل مزاجی سے مل جُل کر شہر آباد کرتی ہیں۔ آپس میں ایک دوسرے کی خاطر قربانی دیتی ہیں لیکن لڑائی جھگڑے اور حسد سے پرہیز کرتی ہیں۔ اس موقع پر بانو قدسیہ انسانی سماج پر طنز کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

"ہم لوگ ان کے سامنے کتنے خود غرض اور کاہل تھے۔ ہمارے اپنے اپنے بینک بیلنس ہیں اور اپنی اپنی کوٹھیاں ہیں۔ ہم کسی کے ساتھ مل کر نہیں رہ سکتے کیونکہ ہمارے دل کو چور بیت المال پر ایمان نہیں رکھتا یہ تو خیر بہت مشکل کام ہے ہمیں تو شہر بسانا نہیں آتا۔۔۔۔"(۱۸)

ایک جیسی ساخت رکھنے والی ننھی سی جانیں انتہائی سلیقہ شعار، چست اور نظم و ضبط کی حامل ہوتی ہیں جبکہ دوسری طرف ہم انسانی سماج میں ایک جیسی ساخت رکھنے کے باوجود طبقاتی تقسیم میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ کوئی اعلیٰ ہے تو کوئی ادنیٰ تو کسی کا متوسط طبق۔ یہ سب طبقات ہمارے خود ساختہ ہیں۔ ہم اشرف المخلوقات ہونے کے باوجود ہمارا سماج مثالی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

بانو قدسیہ نے انسانی سماج میں عورت کی زندگی اور اس کے مقام و مرتبے کو شہد کی مکھیوں کی زندگی کے مماثل قرار دیا ہے۔ شہد کی مکھیاں صفائی ستھرائی کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ کروڑوں کے حساب سے یہ زرگل سمیٹتی ہیں مگر یہ موم کی گلیاں گندی نہیں ہونے دیتیں۔ خاکروب مکھیاں ساتھ ساتھ اپنی ٹانگوں اور پروں سے ہمہ وقت صفائی میں مصروف رہتی ہیں اور نرمگسوں کو جو نکھٹوں اور کاہل کہلاتے ہیں ان کو پالتی ہیں:

> "چھتے کے کاہل بانکے جنہیں کھاپی کر پڑ رہنے کے علاوہ اور کچھ کام ہی نہیں ہوتا سب سے زیادہ غلاظت پھیلاتے ہیں لیکن خاکروب مکھیوں کی بھی داد دینا پڑتی ہے جو لمحہ بھر کو بھی شہر گندا نہیں ہونے دیتیں۔"(۱۹)

اسی طرح عورت بھی صفائی پسند اور خاموشی سے اپنے کنبے کے لیے جان کی بازی لگانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی ہے۔ انسانی فطرت ہے کہ مرد گھر سے باہر کے کام کرتا ہے اور اپنی محنت کی اجرت وصول کرتا ہے جبکہ عورت کے ذمے گھر کے کام ہوتے ہیں جنہیں وہ خاموشی سے بغیر معاوضے کے انتہائی خوش اسلوبی سے نپٹاتی ہے۔ عورت کی یہ فطرت ہے کہ ستائش کی تمنا اور صلے کی پرواہ کیے بغیر تمام عمر اپنے خاندان، اپنے کنبے کی وفاشعاریوں میں گزار دیتی ہے۔ مرد گھر سے باہر کے کام کر کے واویلا مچاتا ہے جبکہ عورت خاموشی سے اپنے حصّے کا کام کرتی ہے۔ ناولٹ میں ماں اور عذرا کا کردار اسی عورت کی نمائندگی کرتا ہے جو فطرتاً محنت اور لگن سے کام کرنے والی عورت ہے۔ ناولٹ کا واحد متکلم رکی ٹکی انسانی سماج میں عورت کی زندگی اور شہد کی مکھیوں کی زندگی کو موازنہ یوں کرتا ہے:

> "ان کاہل بانکوں کا جب کبھی بھی مجھے خیال آتا ہے۔ میں یہی سوچتا ہوں مگر بالکل میری طرح ہر گھر میں ایسے ہی جوان ہوں گے جو اصطبل کے سانڈوں کی سی زندگی گزار رہے ہیں۔ کھالیا۔ سو لیا۔ جہاں کپڑے بدلے پُرانے جامے کو اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ جس شیشی کا ڈھکنا کھولا پھر کبھی واپس نہ لگایا۔ خط پڑھا اور لفافہ پرزے پرزے کر کے فرش پر پھینک دیا۔"(۲۰)

ملکہ مکھی (یعسوب) کی تیرہ بختی کی کہانی یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ اس سے آگے بھی اسے بہت جھیلنا پڑتا ہے۔ بیوگی کا غم لینے کے بعد اسے اپنی سلطنت، اپنی راجدھانی، اپنی رعایا، چھتہ سب سے مرحوم ہونا پڑتا ہے کیونکہ اس

کی کوکھ جنی شہزادیاں جوان ہو چکی ہیں اور وہ اپنے بند شیش محلوں میں سے نکلنے والی ہیں تو ملکہ اپنا شہد سے بھرا ہوا چھتہ ان کے لیے چھوڑ کر چل نکلتی ہے اور دوسری طرف چھتہ میں پائی جانے والی اس کی بیٹیوں کو یہ تک معلوم نہیں ہوتا کہ اس کی ماں محض ان کے لیے دور دراز کے سفر مول لے رہی ہے اور خود غربت اور کسمپرسی کو دعوت دی کر ان کے لیے بھرے خزانے چھوڑ کر جا رہی ہے۔

''موم کی گلیاں'' ایک تمثیلی ناولٹ ہے۔ بانو نے انسانی معاشرے اور شہد کے چھتے کے تماثل کا حق ادا کیا ہے۔ خصوصاً مگس بانی (Apiology) کے نکات کو بڑی باریک بینی اور مہارت سے پیش کیا ہے۔ یہ ناولٹ اپنے آغاز سے اختتام تک معنی خیز اور دلچسپ ہے۔ افسانوی ادب کی تاریخ میں یہ ناولٹ ایک اہم سنگِ میل قرار دیا جائے گا۔ وہ بہت سے مقامات پر انسانوں پر طنز کرنے کے لیے حیوانوں کی مثالیں بیان کرتی ہیں۔ بانو قدسیہ کا یہ انداز انوکھا اور نرالا ہے۔ جس کی وجہ سے ان کو اردو ادب میں نمایاں مقام حاصل ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ممتاز مفتی، بانو قدسیہ۔۔ پتی بھگت، مشمولہ: اور اوکھے لوگ، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۱ء، ص:۱۵۵

۲۔ ممتاز مفتی، اشفاق احمد۔۔ داستان گو، مشمولہ: اور اوکھے لوگ، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۹۱ء، ص:۱۱۸

۳۔ ذکا الرحمن، سید جاوید اختر، جان پہچان، مشمولہ: ادب لطیف، ماہنامہ، لاہور: فروری مارچ، ۱۹۶۶ء

۴۔ بانو قدسیہ، توجہ کی طالب (فلیپ)، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۸۵ء

۵۔ ممتاز مفتی، ایک المیہ۔۔۔ بانو قدسیہ، مشمولہ: چہار سو، ماہنامہ، راولپنڈی، ۱۹۹۳ء، ص:۶۵۔۶۶

۶۔ بانو قدسیہ، موم کی گلیاں، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء، ص:۲۰

۷۔ ایضاً، ص:۲۴

۸۔ ایضاً، ص:۲۸

۹۔ ایضاً، ص:۲۹

۱۰۔ ایضاً، ص:۳۰

۱۱۔ ایضاً، ص:۳۶

۱۲۔ ایضاً، ص:۳۰

۱۳۔ ایضاً، ص:۴۱

۱۴۔ ایضاً، ص:۴۲۔۳۸

۱۵۔ بانو قدسیہ، چہار چمن، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۹ء، ص:۵۶۔۲۵۵

۱۶۔ بانو قدسیہ، موم کی گلیاں، ایضاً، ص:۲۵۴

۱۷۔ ایضاً، ص:۶۶۔۲۶۵

۱۸۔ ایضاً، ص:۶۱۔۲۶۰

۱۹۔ ایضاً، ص:۲۶۱

۲۰۔ ایضاً، ص:۶۲۔۲۶۱